OPEN ACCESS
MA'ARIF-E-ISLAMI (AOU)
ISSN (Print): 1992-8556
ISSN (Online): 2664-0171
https://mei.aiou.edu.pk

اجتماعی اجتہاد بذریعہ مجلس اہل حل وعقد: تصور اور تاریخ

Collective Ijtihād Through Majlis Ahl Ḥall wa ʿAqd: Concepts and History

ڈاکٹر حافظ محمد زبیر
اسسٹنٹ پروفیسر، کامساٹس یونیورسٹی اسلام آباد، لاہور کیمپس، لاہور
ڈاکٹر حافظ طاہر اسلام
لیکچرار، شعبہ فکر اسلامی، تاریخ و ثقافت، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد

Abstract

There are two types of Ijtihād: individual and collective. When an individual Muslim Jurist perform Ijtihād it is called individual Ijtihād and when a Council of Islamic Jurists or qualified scholars undertake utmost effort to discover the Sharia ruling then it is called collective Ijtihād. This research article identifies different ways of collective Ijtihād. A governmental and non-governmental organization of qualified scholars i.e. Majlis Ahl Ḥall wa ʿAqd is also an appropriate platform for collective Ijtihād. Such jurists' groups must be established in every Islamic country and society. In addition, there should be an international jurist's counseling organization, which represents the entire Muslim Ummah.

Keywords: Ijtihād, Collective Ijtihād, Shūrā, Ahl Ḥall wa ʿAqd

موضوع کا تعارف

جن مسائل میں وحی نازل نہیں ہوئی ہوتی تھی، رسول اللہ ﷺ ان میں اجتہاد فرما لیا کرتے تھے۔ اسی طرح آپ نے صحابہ کرام کی بھی اجتہادی تربیت فرمائی تھی اور آپ ﷺ اپنی زندگی ہی میں وقتاً فوقتاً ان کے اجتہادات کی تصحیح یا تائید بھی فرماتے رہتے تھے۔ آپ کی وفات کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں اجتہاد کا یہ عمل ریاستی و قومی سطح پر منظم ہوا۔ تابعین کے دور میں بھی سلطنت اسلامیہ کے وسعت کی وجہ سے نئے نئے مسائل سامنے آئے اور روزہ مرہ زندگی کے معاملات میں اجتہاد کی ضرورت و اہمیت اور بڑھ گئی۔ تبع تابعین اور ائمہ اربعہ کے زمانہ میں مسلمان عربوں کے دوسری اقوام کے ساتھ میل جول اور اختلاط کی وجہ سے باہمی معاملات میں پیچیدگیاں پیدا ہوئیں، علماء نے مستقل اصول وضع کیے اور ان کی روشنی میں اجتہادی عمل کو اس کے عروج تک پہنچایا۔ کئی ایک مکاتب فکر وجود میں آ گئے اور ہر مکتب فکر کے ائمہ نے اپنے اصول و فروع کو مدون کیا۔ چناچہ فقہ اسلامی کے نام سے ایک بہت بڑا علمی ذخیرہ وجود میں آ گیا، جس میں بلاشبہ انسا   انی زندگی سے متعلقہ لکھو کھا مسائل کے بارے شرعی رہنمائی جاری کی گئی تھی۔

سترہویں صدی عیسوی کے صنعتی انقلاب، بیسویں صدی عیسوی کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی تبدیلیوں اور اکیسویں صدی عیسوی میں ٹیکنالوجی کی ترقی نے جہاں سارے عالم کو متاثر کیا، وہاں مذہب کی دنیا میں بھی اَن گنت سوال پیدا کر دیے۔ صنعتی ترقی اور معاشی تبدیلیوں کی وجہ سے کاروبار کی ہزاروں ایسی نئی شکلیں متعارف ہوئیں کہ جن کی شرعی حیثیت معلوم کرنا وقت کا ایک اہم تقاضا تھا۔ سیاسی انقلاب نے جمہوریت، انتخابات، پارلیمنٹ، آئین اور قانون جیسے نئے تصورات سے دنیا کو آگاہی بخشی۔ معاشرتی تبدیلیوں سے مرد وزن کے اختلاط اور باہمی تعلق کی حدود ودائرہ کار جیسے مسائل پیدا ہوئے۔ میڈیکل سائنس اور ٹیکنالوجی نے ایجادات کی دنیا میں ایک انقلاب پیدا کر دیا جس سے کئی ایک ایجادات کے بارے شرعی حکم جاننے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ انیسویں صدی کے اُواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں عالم اسلام کے اکثر وبیشتر ممالک میں اجتہاد کی تحریکیں برپا ہوئیں۔ تہذیب وتمدن کے ارتقاء کے نتیجے میں پیدا ہونے والے ہزاروں نہیں بلکہ لکھوکھا مسائل میں علماء نے رہنمائی کی۔ فتاوی کی ہزاروں جلدیں مرتب ہوئیں اور اجتہاد کے عمل کو منظم انداز میں آگے بڑھانے کے لیے کئی ایک اجتماعی ادارے، فقہ اکیڈمیاں اور علماء کونسلیں وجود میں آنا شروع ہوئیں۔

علاوہ ازیں آج سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی کے ساتھ ساتھ ہر علم کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا ہے کہ ایک مجتہد اور فقیہ کے لئے ہر ایک شعبہ علم میں مہارت پیدا کرنا تو دور کی بات، اس کے مبتدیات کا احاطہ کرنا بھی ناممکن ہو گیا ہے۔ مزید برآں فقہ الاحکام (دین) سے متعلق مختلف علوم وفنون پر دسترس رکھنے والے علماء تو بہت مل جائیں گے لیکن فقہ الواقعہ (دنیا) سے تعلق رکھنے والے اجتماعی اور انسانی علوم ومسائل کی واقفیت علماء میں تقریباً ناپید ہے۔ آج ایک عالم دین کو جن مسائل کا سامنا ہے وہ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے تمام شعبوں کا احاطہ کرتے ہیں۔ ان متنوع مسائل کا صحیح معنوں میں ادراک کرنا اور شریعت کی روشنی میں ان کا حل پیش کرنا ایک عالم دین کے لئے ناممکن ہے۔ آج اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ علماء کی انفرادی اجتہادی کاوشوں کے بجائے اجتماعی سطح پر اجتہاد کے عمل فروغ دیا جائے۔ ایسے ادارے اور فقہی اکیڈمیاں قائم کی جائیں جو اجتماعی اجتہاد کی تحریک کو آگے بڑھا سکیں۔ ان اداروں میں عالم اسلام کے ممتاز اور جید علماء کو نمائندگی حاصل ہو، علماء کے علاوہ مختلف عصری علوم کے ماہرین بھی اس مشاورتی عمل میں شریک ہوں تا کہ زیر بحث مسئلہ کو فنی نقطہ نظر سے سمجھنے میں علماء کی مدد کریں۔ امام شاطبی رحمہ اللہ کے بقول تو اس مشاورتی عمل میں غیر مسلموں کو بھی شریک کیا جا سکتا ہے تا کہ وہ اُمر واقعی کے ان پہلوؤں کو اجاگر کریں جن کا تعلق دنیاوی علوم وفنون سے ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اس قسم کی ملی جلی فکری اور اجتہادی کوششوں سے مسئلہ اور زیادہ نکھر جائے گا، اور تعیین واطلاق کی ایک لائقِ عمل شکل اختیار کر لے گا۔ اسی طرح کا ایک اجتماعی اور شورائی اجتہاد ہی فقہ اسلامی کی معاصر ضرورتوں کو پورا کر سکتا ہے۔

بیسویں صدی عیسوی کے نصف ثانی میں اجتماعی اجتہاد کے لیے کئی ایک قومی اور عالمی سطح کے اداروں کی بنیاد رکھی گئی تاکہ اس دور میں اجتہاد کے مشکل ترین عمل کو اجتماعی صورت میں فروغ دیا جائے۔ ان اداروں میں مصر میں "مجمع البحوث الاسلامیہ"، پاکستان میں "اسلامی نظریاتی کونسل"، یورپ میں "یورپی مجلس برائے افتاء و تحقیق"، مکہ میں "المجمع الفقهی الاسلامی"، سوڈان میں "مجمع الفقہ الاسلامی"، شمالی امریکہ میں "مجمع فقہاء الشریعة"، اردن میں "المجمع الملکی لبحوث الحضارة الاسلامیہ"، ہندوستان میں "اسلامی فقہ اکیڈمی" کویت میں "المنظمة الاسلامیہ للعلوم الطبیة"، جدہ میں "مجمع الفقہ الاسلامی" اور مراکش کی "مجمع أہل البیت" شامل ہیں۔

سابقہ کام کا جائزہ

اجتماعی اجتہاد بطور اصطلاح ایک جدید اصطلاح ہے کہ جس کا استعمال بیسویں صدی کے نصف ثانی میں کثرت سے ہونا شروع ہوا ہے۔ اس موضوع پر وزارت مذہبی امور، قطر کی طرف سے شائع ہونے والی ڈاکٹر عبد المجید السوسوۃ کی کتاب "الاجتهاد الجماعي في التشريع الإسلامي" ایک بنیادی کتاب ہے کہ جس میں امت میں جاری اجتہاد کی اس قسم کے عملی نمونے کو ایک تصور اور فکر کی صورت مرتب انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے بعد اس موضوع پر بحث کو آگے بڑھانے کے لیے ڈاکٹر محمد شعبان اسماعیل کی کتاب "الاجتهاد الجماعي ودور المجامع الفقهية في تطبيقه" شام سے، محمد احمد خلیل کی کتاب "الاجتهاد الجماعي ودور المجامع الفقهية في تحقيقه في عصرنا الحاضر" مصر سے اور مولانا ابوالحسن علی ندوی کی کتاب "الاجتهاد الجماعي" فقہ اکیڈمی، انڈیا کی طرف سے شائع کی گی۔ علاوہ ازیں جامعہ متحدہ عرب امارات نے "ندوة الاجتهاد الجماعي في العالم الإسلامي" کے عنوان سے ایک مجلس قائم کی کہ جس کے تحت اس موضوع پر کروائے گئے سیمینار میں پڑھے گئے مقالہ جات کو "الاجتهاد الجماعي في العالم الإسلامي" کے عنوان سے پبلش کیا گیا۔ اس کے بعد اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد نے بھی اس موضوع پر ایک سیمینار کے مقالہ جات کو "اجتماعی اجتہاد: تصور، ارتقاء اور عملی صورتیں" کے عنوان سے پبلش کیا کہ اسی سیمینار سے ترغیب لے کر مقالہ نگار ڈاکٹر حافظ محمد زبیر نے "عصر حاضر میں اجتماعی اجتہاد: ایک تجزیاتی مطالعہ" کے عنوان سے پنجاب یونیورسٹی سے علوم اسلامیہ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کی تھی۔

اجتماعی اجتہاد کا مفہوم

"ندوة الاجتهاد الجماعي في العالم الإسلامي" کے علماء نے جامعۃ العین متحدہ عرب امارات کلیہ شریعہ کے تحت منعقدہ اجلاس میں ۱۹۹۶ء میں اجتماعی اجتہاد کی درج ذیل تعریف بیان کی ہے:

"تقرر الندوة أن الاجتهاد الجماعي: هو اتفاق أغلبية المجتهدين في نطاق مجمع فقهي أو هيئة أو مؤسسة شرعية ينظمها ولي الأمر في دولة إسلامية على حكم شرعي عملي لم يرد به نص قطعي الثبوت والدلالة بعد بذل غاية الجهد فيما بينهم في البحث والتشاور."[1]

"اجتماعی اجتہاد کی مجلس یہ طے کرتی ہے کہ اجتماعی اجتہاد سے مراد کسی ایسی فقہی اکیڈمی، انجمن یا شرعی ادارے کے تحت کہ جس کی دیکھ بھال اسلامی ریاست کا سربراہ کر رہا ہو، علماء کی اکثریت کا باہمی مشاورت ومباحثہ میں غایت درجے کی کوشش کرتے ہوئے کسی ایسے مسئلے میں شرعی عملی حکم پر اتفاق کر لینا ہے کہ جس میں قطعی الثبوت اور قطعی الدلالۃ نص وارد نہ ہوئی ہو۔"

"حل وعقد" کی لغوی تعریف

حل وعقد ایک مرکب لفظ ہے جو "حل" اور "عقد" سے مل کر بنا ہے۔ یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کے متضاد ہیں۔ "حل" کا مادہ "ح۔ل۔ل" ہے اور اس مادے سے بننے والے عربی الفاظ کا بنیادی معنی "کھولنا" بنتا ہے جبکہ "ع۔ق۔د" کے مادے سے وارد ہونے والے الفاظ کا بنیادی معنی "باندھنا" بنتا ہے۔ ذیل میں ہم أئمہ لغت کے ہاں اس لفظ کا لغوی معنی بیان کر رہے ہیں۔

علامہ سید محمد مرتضی الزبیدی رحمہ اللہ متوفی ۱۲۰۵ھ "حل" کا بنیادی معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ امام راغب رحمہ اللہ نے کہا ہے کہ "حل" کا بنیادی معنی "گرہ کھولنا" ہے جیسا کہ ارشاد باری تعالی ہے: "اور تو گرہ کھول دے میری زبان کی۔"[2] علامہ ابن درید الأزدی رحمہ اللہ متوفی ۳۲۱ھ لکھتے ہیں کہ "حَلَّ العقد يحله حلاً" کہ "اس نے گرہ کھولی اور وہ اس کو کھولتا ہے اور اس کا مصدر "حلاً" آتا ہے۔[3] محمد بن عبد القادر الرازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "حل العقدة فتحها فانحلت" یعنی "حل العقدة" کا معنی نے اس نے گرہ کھول دی ہے، پس وہ کھل گئی۔[4] "عقد" کا لفظ "حل" کا متضاد ہے۔ علامہ زبیدی رحمہ اللہ "عقد" کا معنی بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں: "عقد الحبل والبيع والعهد يعقده عقدا فانعقد" یعنی اس نے رسی، بیع یا عہد باندھا۔[5] محمد بن عبد القادر الرازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں: "عقد الحبل والبيع والعهد فانعقد" یعنی اس نے رسی، بیع یا عہد کو باندھا، پس وہ بندھ گیا۔[6]

پس لغت میں اہل حل وعقد سے مراد وہ لوگ ہیں کہ جو کھولنے اور باندھنے والے ہیں یعنی جو أصحاب اقتدار واختیار ہیں۔ جن کے ہاتھ میں عامۃ الناس کے انتظامی اور ملک وملت کے سیاسی امور ہوں۔

"اہل حل وعقد" کی اصطلاحی تعریف

اہل حل وعقد کی اصطلاح کو دو قسم کے علوم میں زیادہ تر استعمال کیا گیا ہے۔ ایک تو علم أصول فقہ اور دوسرا سیاست شرعیہ میں۔ دونوں علوم میں یہ لفظ مختلف معانی میں استعمال ہوا ہے۔

۱) اصول فقہ میں 'اہل حل وعقد' کا معنی و مفہوم

بعض أصولیین اجماع کی تعریف میں اہل حل وعقد کی اصطلاح استعمال کرتے نظر آتے ہیں۔علامہ آمدی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وَالْحَقُّ فِي ذَلِكَ أَنْ يُقَالَ: الْإِجْمَاعُ عِبَارَةٌ عَنِ اتِّفَاقِ جُمْلَةِ أَهْلِ الْحَلِّ وَالْعَقْدِ مِنْ أُمَّةِ مُحَمَّدٍ فِي عَصْرٍ مِنَ الْأَعْصَارِ عَلَى حُكْمِ وَاقِعَةٍ مِنَ الْوَقَائِعِ."[۷]

"حق بات تو یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ اجماع سے مراد ایک زمانے میں موجود امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جمیع اہل حل وعقد کا کسی مسئلے کے شرعی حکم پر اتفاق کر لینا ہے۔"

امام رازی رحمہ اللہ اجماع کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وأما في اصطلاح العلماء فهو عبارة عن اتفاق أهل الحل والعقد من أمة محمد صلى الله عليه وسلم على أمر من الأمور."[۸]

"علماء کی اصطلاح میں اجماع سے مراد کسی مسئلے میں امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جمیع اہل حل وعقد کا اتفاق ہے۔"

أصولیین جب اہل حل وعقد کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد علمائے مجتہدین ہوتی ہے کیونکہ اجماع مجتہد علماء کا ہی معتبر ہے۔امام رازی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"ونعني بأهل الحل والعقد المجتهدين في الأحكام الشرعية."[۹]

"اہل حل وعقد سے ہماری مراد أحکام شرعیہ میں اجتہاد کرنے والے ہیں۔"

امام بیضاوی رحمہ اللہ اجماع کی تعریف میں لکھتے ہیں:

"وهو اتفاق أهل الحل والعقد من أمة محمد –صلى الله عليه وسلم– على أمر من الأمور."[۱۰]

"اجماع سے مراد کسی مسئلے میں امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے جمیع اہل حل وعقد کا اتفاق ہے۔"

امام اسنوی رحمہ اللہ أہل حل وعقد کے لفظ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"وقوله: أهل الحل والعقد أي: المجتهدين."[۱۱]

"امام بیضاوی رحمہ اللہ کے قول اہل حل وعقد سے مراد مجتہدین امت ہیں۔"

۲) سیاست شرعیہ میں "اہل حل وعقد" کا معنی و مفہوم

"اہل حل وعقد" کا دوسرا معروف معنی جو سیاست شرعیہ میں مستعمل ہے، وہ أصحاب اقتدار واختیار ہے یعنی "اہل حل وعقد" سے مراد وہ لوگ ہیں جو معاشرے میں عامۃ الناس کے رہنما، سردار اور لیڈر شمار ہوتے ہیں اور عوام دنیاوی

معاملات میں ان کے متبع ہوں۔ یہ حضرات کسی بھی اسلامی ریاست میں امام وقت کو منتخب کرنے کا فریضہ سر انجام دیتے ہیں۔ اس لیے ان کا ذکر عموماً امام کی بیعت کے ذیل میں آتا ہے۔ علامہ الجزیری رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"واتفق الأئمة – على أن الإمامة تنعقد ببيعة أهل الحل والعقد من العلماء، والرؤساء، ووجوه الناس، الذين يتيسر اجتماعهم"[12]

"ائمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ امامت ایسے اہل حل وعقد کی بیعت سے منعقد ہو جاتی ہے جو علماء، سرداروں اور أصحاب عزت و مرتبہ میں سے ہوں اور ان کا اجتماع آسانی سے ممکن ہو۔"

علامہ ابن نجیم رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وَتَنْعَقِدُ بَيْعَةُ أَهْلِ الْحَلِّ وَالْعَقْدِ مِنْ الْعُلَمَاءِ الْمُجْتَهِدِينَ وَالرُّؤَسَاءِ لِمَا عُرِفَ."[13]

"اہل حل وعقد یعنی معروف مجتہد علماء اور سرداروں کی بیعت سے (امامت) منعقد ہو جاتی ہے۔"

امام نووی رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"وتنعقد الإمامة بالبيعة والأصح بيعة أهل الحل والعقد من العلماء والرؤساء ووجوه الناس الذين يتيسر اجتماعهم."[14]

"امامت، بیعت کے ساتھ منعقد ہو جاتی ہے اور صحیح قول کے مطابق اہل حل وعقد یعنی علماء، سرداروں اور أصحاب فضل کی بیعت سے امامت منعقد ہو جاتی ہے۔"

کویت کے موسوعہ فقہیہ کے مقالہ نگار "اہل حل وعقد" کی تعریف بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"يُطْلَقُ لَفْظُ أَهْل الْحَل وَالْعَقْد عَلَى أَهْل الشَّوْكَةِ مِنَ الْعُلَمَاءِ وَالرُّؤَسَاءِ وَوُجُوهِ النَّاسِ الَّذِينَ يَحْصُل بِهِمْ مَقْصُودُ الْوِلاَيَةِ، وَهُوَ الْقُدْرَةُ وَالتَّمَكُّنُ، وَهُوَ مَأْخُوذٌ مِنْ حَل الأُمُورِ وَعَقْدِهَا."[15]

"اہل حل وعقد کا لفظ ان أصحاب شان و شوکت کے لیے بولا جاتا ہے جو علماء، سرداروں اور أصحاب عزت و مرتبہ میں سے ہوں اور ان کے ذریعے ولایت یعنی اقتدار اور سلطنت حاصل ہو۔ یہ لفظ مختلف امور کو کھولنے اور بند کرنے سے ماخوذ ہے۔"

فی زمانہ "اہل حل وعقد" سے معروف علماء، سماجی تنظیموں کے رہنما، مذہبی قائدین، اسلامی تحریکوں اور جماعتوں کے أمراء، مختلف قبائل کے عمائدین، اداروں، جاگیردار اور ملک، اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے لڑنے والی صوبائی، لسانی اور علاقائی تنظیموں کے لیڈرز، دینی رہنما، پولیس اور انتظامیہ کے آفیسرز، نیوی، فضائیہ اور آرمی کے جرنیلز وغیرہ مراد ہو سکتے ہیں۔ "اہل حل وعقد" کی اصطلاح اس کے علاوہ بھی کئی ایک مفاہیم میں استعمال کی گئی ہے لیکن معروف معانی یہی دو ہیں جو ہم اوپر بیان کر چکے۔ اس مقالہ میں پہلی قسم کے لیے ہم "علمی مجلس" اہل حل وعقد اور دوسری کے لیے

"مقتدر مجلس" اہل حل و عقد کی اصطلاح استعمال کریں گے۔ اور پہلی قسم کو ہم مزید دو حصوں میں تقسیم کریں گے ایک "سرکاری علمی مجلس" اور دوسری "غیر سرکاری علمی مجلس"۔

مجلس اہل حل و عقد اور شوری میں فرق

شوری اور مجلس اہل حل و عقد میں بھی فرق ہے لیکن یہ فرق ان کے دائرہ اجتہاد کے اعتبار سے ہوگا۔ مقتدر شوری تو ان مجتہد علماء، فقہاء اور ماہرین فن پر مشتمل ہوگی جو دینی اور دنیوی امور میں اجتہاد کریں اور پھر اس اجتہاد کی روشنی میں ریاست کے لیے کوئی قانون وضع کریں جبکہ مقتدر مجلس اہل حل و عقد کا کام صرف امام وقت کا انتخاب ہے۔ موسوعہ فقہیہ کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"الْمُسْتَقْرِئُ لِحَوَادِثَ التَّارِيخِ يَجِدُ أَنَّ هُنَاكَ فَرْقًا بَيْنَ أَهْلِ الشُّورَى وَأَهْلِ الْحَلِّ وَالْعَقْدِ، إِذِ الصِّفَةُ الْبَارِزَةُ فِي أَهْلِ الشُّورَى هِيَ الْعِلْمُ لَكِنِ الصِّفَةُ الْبَارِزَةُ فِي أَهْلِ الْحَلِّ وَالْعَقْدِ هِيَ الشَّوْكَةُ."[۱۶]

"تاریخی حوادث کا استقرائی مطالعہ کرنے والے کے لیے یہ بات واضح ہو جائے گی کہ اہل شوری اور اہل حل و عقد کے مابین فرق ہے کیونکہ اہل شوری میں اہم ترین صفت علم ہوتی ہے جبکہ اہل حل و عقد کی نمایاں صفت شان و شوکت (دبدبہ) ہے۔"

یہ تو مقتدر مجلس اہل حل و عقد کا وظیفہ ٹھہرا۔ اب ہم علمی مجلس اہل و عقد کی تاریخ و وظائف پر مختصر روشنی ڈالتے ہیں۔

علمی مجلس اہل حل و عقد کی تاریخ

تاریخ اسلامی کے شروع کے ادوار میں ہی اجتماعی اجتہاد کے لیے فقہاء کی مجالس قائم ہوا کرتی تھیں۔ دور تابعین میں مدینہ میں سات فقہاء کی ایک مجلس تھی جو فقہائے سبعہ کے نام سے معروف تھے۔ معروف مؤرخ ابن عساکر رحمہ اللہ متوفی ۵۷۱ھ ان کے بارے لکھتے ہیں:

"كان فقهاء أهل المدينة الذين كانوا يصدرون عن رأيهم سبعة سعيد المسيب وسليمان بن يسار وسالم بن عبد الله والقاسم بن محمد وعروة بن الزبير وعبيد الله بن عبد الله بن عتبة وخارجة بن زيد قال وكانوا إذا جاءتهم المسألة دخلوا فيه جميعا فنظروا فيها ولا يقضي القاضي حتى يرفع إليهم فينظرون فيها فيصدرون."[۱۷]

"فقہائے اہل مدینہ کہ جو اپنی فقہی آراء کا اظہار کرتے تھے، سات تھے؛ سعید بن مسیب، سلیمان بن یسار، سالم بن عبداللہ، قاسم بن محمد، عروہ بن زبیر، عبید اللہ بن عبد اللہ بن عتبہ اور خارجہ بن زید رحمہم اللہ۔ جب ان لوگوں کے پاس کوئی مسئلہ آتا تھا تو وہ اس میں مل جل کر غور کرتے اور کوئی بھی قاضی کسی نئے مسئلے میں اس وقت تک فیصلہ نہیں کرتا تھا جب تک کہ وہ ان کی مجلس میں اس مسئلے کو پیش نہ کر لیتا تھا اور وہ اس میں غور و فکر کے کوئی فیصلہ صادر نہ کر دیتے تھے۔"

اسی طرح امام مالک رحمہ اللہ کے زمانے میں بھی مدینہ میں فقہائے اہل مدینہ مختلف مسائل پر وقتاً فوقتاً مل جل کر مشاورت کرتے رہتے تھے۔ مشاورت کا یہ طریقہ فقہائے سبعہ کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ شیخ أبو زہرہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں:

"امام مالک رحمہ اللہ کی مدینہ میں مجلس علمی قائم تھی، اس میں بڑے بڑے علماء سے مذاکرے کرتے تھے، خواہ مدینہ کے باشندہ ہوں یا وفد میں مدینہ آئے ہوں... فقہی مسائل کے مذاکرہ کے لیے چونکہ امام مالک رحمہ اللہ کو خاص توجہ تھی، اس لیے فقہائے مدینہ کے لیے ان کی ایک مخصوص مجلس تھی، یا جو علماء مدینہ میں مقیم ہوں وہ شریک ہوتے تھے لیکن عوام کے لیے اس مجلس کا دروازہ کھلا ہوا نہیں تھا۔ مدارک میں لکھا ہوا ہے: ابن المنذر رحمہ اللہ نے کہا کہ امام مالک رحمہ اللہ کا ایک حلقہ تھا کہ اس میں صرف فقہائے مدینہ کو بٹھاتے تھے، اسے کسی کے لیے وسیع نہ کرتے تھے، نہ اس میں کسی کو بلاتے تھے جو اس میں بیٹھ سکے جب تک کہ مجلس ختم نہ ہو جائے۔"[۱۸]

امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی بھی کوفہ میں ایک اجتماعی مجلس تھی، جس میں وہ بعض اوقات اپنے شاگردوں اور معاصر علماء کے ساتھ مل کر کوئی فتوی جاری کرتے تھے۔ مفتی عزیز الرحمٰن بجنوری لکھتے ہیں:

"چناچہ امام صاحب نے اپنے ہزاروں شاگردوں میں سے چالیس ماہر فن اشخاص منتخب کیے۔ امام طحاوی رحمہ اللہ نے بسند متصل بیان کیا ہے کہ اس مجلس کے اراکین کی تعداد چالیس تھی۔ یہ سب کے سب حضرات درجہ اجتہاد کو پہنچے ہوئے تھے۔ ان چالیس میں سے دس بارہ حضرات کی ایک اور مجلس خصوصی تھی۔ جس کے رکن امام أبو یوسف، امام زفر، داؤد طائی، أحمد بن عمر، یوسف بن خالد، یحی بن زائدۃ، امام محمد، عبداللہ بن مبارک اور خود امام ابو حنیفہ رحمہم اللہ تھے۔"[19]

اہل حل وعقد کی صفات

چونکہ اہل حل وعقد کی مجلس کا بنیادی مقصد امام کا انتخاب یا اجتہاد ہے لہٰذا ان حضرات کی بنیادی خصوصیات بھی ایسی ہونی چاہیے کہ جن سے ان کے لیے اپنے اس فریضے کی ادائیگی ممکن ہو۔ موسوعہ فقہیہ کے مقالہ نگار اہل حل وعقد کی صفات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"أ – الْعَدَالَةُ الْجَامِعَةُ لِشُرُوطِهَا الْوَاجِبَةِ فِي الشَّهَادَاتِ مِنَ الإِسْلاَمِ وَالْعَقْلِ وَالْبُلُوغِ وَعَدَمِ الْفِسْقِ وَاكْتِمَال الْمُرُوءَةِ. ب – الْعِلْمُ الَّذِي يُوصَل بِهِ إِلَى مَعْرِفَةِ مَنْ يَسْتَحِقُّ الإِمَامَةَ عَلَى الشُّرُوطِ الْمُعْتَبَرَةِ فِيهَا. ج – الرَّأْيُ وَالْحِكْمَةُ الْمُؤَدِّيَانِ إِلَى اخْتِيَارِ مَنْ هُوَ لِلإِمَامَةِ أَصْلَحُ. د – أَنْ يَكُونَ مِنْ ذَوِي الشَّوْكَةِ الَّذِينَ يَتَّبِعُهُمُ النَّاسُ، وَيَصْدُرُونَ عَنْ رَأْيِهِمْ؛ لِيَحْصُل بِهِمْ مَقْصُودُ الْوِلاَيَةِ. ه – الإِخْلاَصُ وَالنَّصِيحَةُ لِلْمُسْلِمِينَ."[۲۰]

"پہلی شرط تو ایسی عدالت ہے جو ان تمام شرائط کو جامع ہو جن کا پایا جانا شہادت کے باب میں لازم ہے جیسا کہ اسلام، عقل، بلوغت، عدم فسق اور کمال درجے میں اعلی اخلاق وعادات کا حصول ہے۔ دوسری شرط یہ ہے کہ اس کے پاس اتنا علم ہو جس کے ذریعے اس کے لیے یہ معلوم کرنا آسان ہو کہ کون شخص امامت کا زیادہ مستحق ہے۔ تیسری شرط یہ ہے

کہ اس میں اس قدر حکمت اور سمجھداری ہو جس کی بدولت وہ یہ فیصلہ کر سکتا ہو کہ کون شخص امامت کے لیے زیادہ مناسب ہے۔ چوتھی شرط یہ ہے کہ اس کا معاشرے میں رعب و دبدبہ ہو اور لوگ اس کی اتباع کرتے ہوں اور اپنی رائے رکھتے ہوں تا کہ ان کے ذریعے امامت کا مقصود حاصل ہو۔ پانچویں شرط یہ ہے کہ وہ اہل اسلام کا خیر خواہ اور ان کے حق میں مصلح ہو۔"

ڈاکٹر وہبہ الزحیلی رحمہ اللہ نے ان صفات کا خلاصہ درج ذیل عبارت میں جمع کر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

"وإما ببيعة أهل الحل والعقد: وهم من اجتمع فيهم ثلاثة أمور: العلم بشروط الإمام، والعدالة، والرأي."[۲۱]

"اسی طرح امامت، اہل حل و عقد کی بیعت سے بھی منعقد ہو جاتی ہے اور اہل حل و عقد سے مراد وہ لوگ ہیں جن میں یہ تین صفات ہوں: امام کی شروط کا علم، عدالت اور سمجھداری۔"

یہ شرائط تو ان اہل حل و عقد کے لیے ہیں جو امام کا انتخاب کرتے ہیں۔ اگر اہل حل و عقد کی کوئی ایسی مجلس ہو جو اجتہاد کا فریضہ سر انجام دے رہی ہو تو اس میں عدالت کے علاوہ بنیادی ترین شرط ایسا علم ہو گا جو اس کو درجہ اجتہاد پر فائز کرتا ہو۔ یعنی اس میں صفت عدالت کے ساتھ ساتھ ایک مجتہد کی بھی شرائط پائی جا رہی ہوں جیسا کہ امام رازی کا یہ قول گزر چکا:

"ونعني بأهل الحل والعقد المجتهدين في الأحكام الشرعية."[۲۲]

"اہل حل و عقد سے ہماری مراد أحکام شرعیہ میں اجتہاد کرنے والے ہیں۔"

مجلس اہل حل و عقد کی ذمہ داریاں

علمی اور مقتدر دونوں طرح کی مجالس اہل حل و عقد کے اعمال وافعال کا دائرہ کار علیحدہ علیحدہ ہو گا۔ ایک "مقتدر مجلس اہل حل و عقد" کی ذمہ داریوں کے بارے میں بحث کرتے ہوئے موسوعہ فقہیہ کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"تَوْلِيَةُ الْخَلِيفَةِ: وَهَذَا إِجْمَاعٌ لاَ خِلاَفَ فِيهِ لأَحَدٍ مِنْ أَهْلِ السُّنَّةِ وَالْجَمَاعَةِ. ب - تَجْدِيدُ الْبَيْعَةِ لِمَنْ عَهِدَ إِلَيْهِ بِالإِمَامَةِ عِنْدَ وَفَاةِ الإِمَامِ ... ج - اسْتِقْدَامُ الْمَعْهُودِ إِلَيْهِ الْغَائِبِ عِنْدَ مَوْتِ الإِمَامِ. د - تَعْيِينُ نَائِبٍ لِلإِمَامِ الَّذِي وُلِّيَ غَائِبًا إِلَى أَنْ يَقْدُمَ ... هـ - عَزْلُ الإِمَامِ عِنْدَ وُجُودِ مَا يَقْتَضِيهِ وَيُنْظَرُ فِي إِمَامَتِهِ."[۲۳]

"اس مجلس کی پہلی ذمہ داری خلیفہ کا تقرر ہے اور اس ذمہ داری کے بارے میں اہل سنت والجماعہ کا اجماع ہے اور ان میں سے کسی کا بھی اختلاف نقل نہیں ہوا ہے۔ دوسری ذمہ داری امام وقت کی وفات کے بعد جس کو یہ ذمہ داری سونپی گئی ہو، اس سے تجدید بیعت کرنا... تیسری ذمہ دار امام کی وفات کے وقت جس غائب شخص کو امامت کی ذمہ داری سونپی گئی ہے، اس کو طلب کرنا۔ چوتھی ذمہ داری اس امام کے نائب کا تعین کرنا جو کسی غائب امام کی جگہ حکمران بنا ہو یہاں تک وہ غائب امام منظر پر آ جائے... پانچویں ذمہ داری امام کو کسی ایسی وجہ سے معزول کرنا جو اس کی معزولی کا تقاضا کرتی ہو اور اس کی امامت کو محل نظر بناتی ہو۔"

علماء کا اس مسئلے میں بھی اختلاف ہے کہ امامت کے منعقد ہونے کے لیے کم از کم کتنے اہل حل وعقد کا ہونا لازم ہے۔ اکثریت کی رائے یہی ہے کہ اس کے لیے کوئی خاص عدد متعین نہیں ہے۔ موسوعہ فقہیہ کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

"اخْتَلَفَ الْعُلَمَاءُ فِي عَدَدِ مَنْ تَنْعَقِدُ بِهِمُ الإِمَامَةُ مِنْ أَهْلِ الْحَل وَالْعَقْدِ عَلَى مَذَاهِبَ شَتَّى فَقَالَتْ طَائِفَةٌ: لاَ تَنْعَقِدُ إِلاَّ بِأَكْثَرِيَّةِ أَهْلِ الْحَل وَالْعَقْدِ مِنْ كُل بَلَدٍ؛ لِيَكُونَ الرِّضَى بِهِ عَامًّا، وَالتَّسْلِيمُ لإِمَامَتِهِ إِجْمَاعًا، وَهُوَ مَا ذَهَبَ إِلَيْهِ الْحَنَابِلَةُ، قَال الإِمَامُ أَحْمَدُ: الإِمَامُ الَّذِي يُجْتَمَعُ عَلَيْهِ، كُلُّهُمْ يَقُول: هَذَا إِمَامٌ وَقَالَتْ طَائِفَةٌ أُخْرَى: أَقَل مَنْ تَنْعَقِدُ بِهِ مِنْهُمْ خَمْسَةٌ، يَجْتَمِعُونَ عَلَى عَقْدِهَا، أَوْ يَعْقِدُهَا أَحَدُهُمْ بِرِضَى الأَرْبَعَةِ. وَالَّذِي عَلَيْهِ الْحَنَفِيَّةُ وَالشَّافِعِيَّةُ أَنَّ الإِمَامَةَ تَنْعَقِدُ بِتَوْلِيَةِ جَمَاعَةٍ مِنْ أَهْلِ الْحَل وَالْعَقْدِ دُونَ تَحْدِيدِ عَدَدٍ مُعَيَّنٍ."[٢٤]

"علماء کا اس مسئلے میں اختلاف ہے کہ کتنے اہل حل وعقد ہوں تو امامت منعقد ہو جاتی ہے۔ اس بارے کئی ایک مذاہب ہیں۔ علماء کی ایک جماعت کا کہنا یہ ہے کہ ہر شہر کے جمہور اہل حل وعقد کی بیعت سے امامت منعقد ہوتی ہے تاکہ امام وقت کو عامۃ الناس کی رضامندی حاصل ہو اور اس کی امامت پر لوگوں کا اجماع ہو۔ یہ رائے حنابلہ کی ہے۔ امام احمد بن حنبل رحمہ اللہ کا کہنا ہے کہ امام وہی ہے کہ جس پر اجماع ہو جائے، اس طرح کہ ہر ایک یہ کہے کہ یہ ہمارا امام ہے۔ علماء کی ایک دوسری جماعت کا کہنا ہے کہ کم از کم پانچ اہل حل وعقد ہوں تو ان کی بیعت سے امامت منعقد ہو جاتی ہے یا ان پانچ میں سے کوئی ایک بھی بقیہ چار کی رضامندی سے ایک کی بیعت کر لے تو پھر بھی امامت منعقد ہو جاتی ہے۔ حنفیہ اور شافعیہ کا کہنا یہ ہے کہ اہل حل وعقد کی ایک غیر معین جماعت کے کسی کو ذمہ داری سونپ دینے سے امامت منعقد ہوتی ہے۔"

مجلس اہل حل وعقد کا انتخاب اور منہج فتویٰ

مجلس اہل حل وعقد کے انتخاب کے بھی دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک تعیین کا طریقہ اور دوسرا انتخاب کا طریقہ۔ جہاں تک "مقتدر مجلس اہل حل وعقد" کا تعلق ہے تو اس بارے ہماری رائے میں انتخاب کا طریقہ ہی زیادہ مناسب اور بہتر ہے کیونکہ اس مجلس کا کام امام وقت کا انتخاب ہے تو اس میں اسلامی ریاست کے تمام شہروں کے شہریوں کی رائے کا احترام ایک لازم امر ہے۔ "علمی مجلس اہل حل وعقد" کے انتخاب کے لیے ہماری رائے میں بہترین طریقہ تعیین کا ہے کہ یہ طریقہ اس مجلس کے مقاصد کو زیادہ اچھی طرح پورا کرنے والا ہے۔

ایک غیر سرکاری علمی مجلس کی تعیین کا طریقہ کوئی سا بھی ہو سکتا ہے۔ مجلس ایک مذہب کے علماء پر بھی مشتمل ہو سکتی ہے جیسا کہ مولانا محمد یوسف بنوری صاحب کے دور میں کراچی کے دیوبندی علماء نے نئے مسائل میں فتویٰ جاری کرنے کے لیے ایک مشترکہ مجلس "مجلس تحقیق مسائل حاضرہ" کے نام سے قائم کر رکھی تھی۔ یہ مجلس کچھ عرصہ تک متحرک رہی، اس کے بعد ختم ہو گئی۔ اسی طرح ایسی مجلس ایک سے زائد مذاہب کی نمائندگی بھی کر سکتی ہے جیسا کہ لاہور میں پچھلے

کئی سالوں سے بریلوی، دیوبندی اور اہل حدیث علماء نے مل کے "ملی مجلس شرعی" کے نام سے جدید مسائل میں اجتہاد کے لیے ایک مشترکہ مجلس قائم کر رکھی ہے جس کے اجلاس وقتاً فوقتاً منعقد ہوتے رہتے ہیں۔

مولانا صلاح الدین یوسف ؒ علمی مجلس اہل حل و عقد کے لیے تعیین کے طریقے کو پسند کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں:

"اجتماعی اجتہاد ہی کے ذریعے سے عصری مسائل کا حل تلاش کیا جانا چاہیے، جس کی صورت یہ ہے کہ عالم اسلام کے فاضل علماء کی ایسی کمیٹی تشکیل دی جائے، جو اپنے اسلامی کردار اور زہد و ورع میں بھی ممتاز اور اس لحاظ سے مسلم عوام میں قابل اعتبار گردانے جاتے ہیں اور وہ قرآنی علوم اور احادیث پر بھی گہری نظر کے ساتھ چاروں مذاہب فقہ کی کتابوں پر دسترس رکھتے ہیں۔"[۲۵]

مولانا آگے چل کر علمی مجلس کے اجتہاد کے طریق کار پر روشنی ڈالتے ہوئے فرماتے ہیں:

"ان متبحر علماء کی کمیٹی میں جدید علوم و فنون یعنی اقتصادیات، اجتماعیات، قانون و تجارت وغیرہ جملہ علوم عصریہ کے ایسے ماہرین شامل کیے جائیں، جو عقیدہ و عمل کے لحاظ سے سچے اور کھرے مسلمان ہوں۔ تعلیم جدید نے ان کی ایمانی بنیادوں کو متزلزل نہ کیا ہو بلکہ وہ عصری مسائل کا ادراک و شعور رکھنے کے ساتھ ان کے شرعی حل کا احساس و جذبہ اور دلی تڑپ بھی رکھتے ہوں تاکہ علمائے شریعت جدید عصری معاملات اور فنی (ٹیکنیکل) مسائل میں ان کی رائے اور تفصیلات پر اعتماد کرتے ہوئے ان سے فائدہ اٹھا سکیں اور جدید مسائل کی تہہ تک پہنچنے میں علماء کو آسانی ہو۔ مذکورہ فقہی کاوشوں (ائمہ سلف کے فقہی ذخیرے) سے استفادہ کرتے ہوئے اور علم جدید سے بہرہ ور دیانت دار لوگوں کی رائے اور معلومات کو سامنے رکھ کر کھلے دل و دماغ سے اجتہادی مسائل کا حل اس اجتماعی طریقے سے نکالا جائے، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم عصری مسائل کو شرعی احکام کے ساتھ تطبیق نہ دے سکیں اور ان کا مناسب حل تلاش نہ کر سکیں۔"[۲۶]

غیر سرکاری علمی مجلس اہل حل و عقد

اکثر و بیشتر علماء کا کہنا یہ ہے کہ علمی مجلس کو سرکاری یا حکومتی سرپرستی حاصل نہیں ہونی چاہیے کیونکہ اس قسم کی ریاستی نگرانی ان کے اجتہاد و تحقیق کے آزادنہ عمل کو متاثر کر سکتی ہے۔ مولانا تقی عثمانی صاحب اجتماعی اجتہاد کرنے والی علمی مجلس کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"یہ بھی ضروری ہے کہ یہ مجلس اپنی قرار دادوں کے پاس کرنے میں آزاد ہو اور حکومت یا دوسری سیاسی پارٹیوں وغیرہ کی طرف سے سیاسی دباؤ سے متاثر نہ ہو اور اسی طرح اس مجلس کا ہر رکن ہر اس رائے کے لیے کھلے ذہن کے ساتھ مشاورت میں شریک ہو، جو کسی دلیل کی بنیاد پر قائم ہو اور کسی مخصوص رائے کے حق میں متعصب نہ ہو۔"[۲۷]

ڈاکٹر توفیق الشاوی کا کہنا ہے کہ تاریخ اسلام کے ایک طویل دورانیے میں اجتہاد کی اجتماعی مجالس کے نہ ہونے کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ہمارے فقہائے سلف کو یہ اندیشہ تھا کہ اس قسم کی مجالس کو حکمران وقت اپنے مذموم مقاصد کے لیے استعمال کر سکتے ہیں۔ لہٰذا انہوں نے انفرادی اجتہاد کو اجتماعی اجتہاد پر ترجیح دی۔ ڈاکٹر توفیق الشاوی آج بھی علماء کو اجتماعی اجتہاد کی سرکاری و حکومتی مجالس سے دور رہنے کی نصیحت فرماتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"بے شک وہ اصل خطرہ آج بھی اکثر و بیشتر ممالک میں موجود ہے کہ جس سے ہمارے فقہائے سلف بھی ڈرتے تھے، اور وہ ان مجالس علمیہ کا کسی سیاسی دباؤ کے تحت واقع ہونا ہے۔ ثقہ علماء کے نہ ہونے کی وجہ سے آج ہم اکثر اس بات کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ بیشتر علماء سرکاری مناصب پر جبراً قابض ہو جاتے ہیں اور حکومتی مراتب کے خواہش مند ہوتے ہیں۔ ان علماء کے بارے میں عامۃ الناس کی ہمیشہ سے یہی رائے رہی ہے کہ ان کی وضاحتیں بلکہ ان کے فتاوی اور قرار دادیں اصحاب اقتدار کی رضامندی حاصل کرنے کے لیے ہوتی ہیں یہاں تک کہ ان علماء کی اکثریت پر لوگوں نے فقہائے سلاطین کا لقب چسپاں کر دیا۔ پس ہمیں یہ پسند نہیں ہے کہ فقہ اسلامی کو حکمرانوں کی مجالس یا ریاستوں اور حکومتوں کے ماتحت اداروں میں محصور کر دیا جائے کیونکہ یہ صورت حال علماء و فقہاء کے انفرادی انحرافات سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ جب ایک فقیہ غلطی یا انحراف کرتا ہے تو کوئی دوسرا اس کی غلطی یا انحراف واضح کر دیتا ہے اور اس کی تردید یا اس پر نقد کرتا ہے۔ جبکہ سرکاری مجالس علمیہ سرکاری مہر پر قبضہ کر لیتی ہیں اور اپنی خدمات کے ذریعے حکومتوں اور بادشاہوں کے لیے ان کی سلطنت کو مضبوط کرنے اور ان کے گروہی، سیاسی اور ذاتی مفادات کو پورا کرنے کے لیے کَل پرزے مہیا کرتی ہیں۔"[۲۸]

ڈاکٹر توفیق الشاوی کے یہ خدشات بعض سرکاری مجالس علمیہ کے بارے میں تو درست ہیں لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ہر سرکاری مجلس علمی لازماً حکومتی مفادات اور مقاصد کو ہی پورا کرنے والی ہو گی، صحیح نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں اصل مسئلہ کسی مجلس کے سرکاری یا غیر سرکاری ہونے کا نہیں ہے بلکہ اراکین مجلس کا ہے۔ ورنہ تو خلفائے راشدین کے دور میں جو مجالس شوری تھیں وہ بھی ایک طرح سے سرکاری نوعیت ہی کی مجالس تھیں کہ جن کے اجتماعی فتاوی جات کو بعض اوقات ملکی قانون کا درجہ بھی دے دیا جاتا تھا۔ پاکستانی حکومت کی زیر نگرانی جب "اسلامی نظریاتی کونسل" کی بنیاد رکھی گئی تو اس میں جلیل القدر علماء مثلاً مولانا محمد یوسف بنوری، مولانا شمس الحق افغانی اور مولانا تقی عثمانی وغیرہ شامل تھے۔ ان علماء کی پیش کردہ تحقیقاتی رپورٹس میں اگرچہ خطاء اور اختلافات کے امکانات موجود ہیں لیکن کسی بھی مذہبی طبقہ یا علماء کی جماعت کی طرف سے یہ بات نہیں ہے کہ "اسلامی نظریاتی کونسل" کا حصہ بننے کے بعد یہ علماء حکومت کے آلہ کار بن کر حکومتی مقاصد کی تکمیل کے لیے تحقیقات پیش کرتے رہے۔ اسی طرح سعودی عرب کے علماء کی سرکاری مجلس "هيئة كبار العلماء" اور مصر کے فقہاء کی حکومتی اکیڈمی "**مجمع البحوث الإسلامية**" کے بارے میں یہ کہنا مشکل تو

کیا تقریباً ناممکن اَمر ہے کہ ان مجالس کے علماء سرکار اور حکومت کی رضامندی اور خوشنودی کے لیے فتاوی جاری کرتے ہیں۔

شاہ عبد الرحیم دہلوی رحمہ اللہ اور بعض دوسرے علماء کا خیال یہ ہے کہ تاریخ اسلام کے طویل دورانیے میں اجتماعی اجتہاد کی مجالس کا نہ پایا جانا، علماء کی کوتاہی ہے۔ڈاکٹر توفیق الشاوی اس نقطہ نظر سے متفق نہیں ہیں۔وہ لکھتے ہیں:

"پس ہم سنہوری، شاہ عبد الرحیم اور ان کے جیسا نقطہ نظر رکھنے والے دیگر علماء سے اس بات میں اتفاق نہیں کرتے کہ تاریخ اسلامی کے طویل دورانیے میں ان مجالس علمیہ کا نہ ہونا، محض علماء کی ایک کوتاہی ہے یا ان کے نظاموں میں تکلف ہے۔ہماری رائے میں صحیح بات یہ ہے کہ علماء کا ایسی علمی مجالس کا قائم نہ کرنا ایک ضرورت کے تحت تھا اور وہ یہ کہ فقہ اسلامی کو حکمرانوں کے تسلط سے دور اور ریاستوں سے آزاد کروایا جائے۔"[۲۹]

ہماری رائے یہ ہے کہ شاہ عبد الرحیم رحمہ اللہ کا قول راجح ہے اور ڈاکٹر توفیق الشاوی صاحب کی تاویل دور از قیاس ہے۔تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ امام مالک رحمہ اللہ اور امام اَحمد بن حنبل رحمہ اللہ پر جبری طلاق اور خلق قرآن کے مسئلے میں سرکاری موقف اختیار کرنے کے لیے جبر و تشدد کی انتہاء کر دی گئی لیکن ان اَئمہ سلف نے اس ظلم و ستم کے باوجود حق بات کی اتباع اور اس کے مطابق فتوی دینا نہ چھوڑا۔جب فقہائے عظام اپنی انفرادی حیثیت میں جابر حکمرانوں کے سامنے نہ جھکتے تھے تو اجتماعی حیثیت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ کوئی حاکم وقت فقہاء کی کسی اجتماعی مجلس علمی کو اپنا زر خرید ادارہ بنا لیتا۔فقہائے سبعہ، امام مالک یا امام اَبو حنیفہ کی فقہی مجالس، کیا حکمرانوں کے مفادات پورے کرتی تھیں؟اس لیے ہمارا نقطہ نظر یہی ہے کہ اگر تابعین اور اَئمہ اَربعہ کے دور کے بعد بھی اجتماعی اجتہاد کی مجالس قائم رہتیں تو شاید فقہ اسلامی کی تاریخ پر اس کے بہت مثبت اثرات ظاہر ہوتے۔

غیر سرکاری مجلس اہل حل وعقد کی اقسام

ایک غیر سرکاری مجلس علمی اپنی ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے کئی قسم کی ہو سکتی ہے۔ڈاکٹر احمد رئیسونی نے اس کی چار اقسام کا تذکرہ کیا ہے جو کہ درج ذیل ہیں:

۱) کسی ایک براعظم یا عالم اسلام کی سطح پر کوئی ایک علمی مجلس جو ایک سے زائد ممالک یا مذاہب اسلامیہ کے نمائندگان پر مشتمل ہو۔ڈاکٹر احمد ریسونی اس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"کسی ایک براعظم پر مشتمل کوئی ادارہ ہو جو عام ممالک اور مذاہب اسلامیہ کے محدود مجتہد علماء کو شامل ہو۔یہ علماء پیش آمدہ مسائل کا ان کے نظائر کی روشنی میں اجتماعی مطالعہ کریں۔پھر اس بارے کوئی اتفاقی یا اکثریتی رائے سے فیصلہ جاری کریں۔اس کی مثال وہ عالمی فقہی مجالس ہیں کہ جن کی بنیاد کوئی ایک مخصوص مذہب نہیں ہے جیسا کہ اسلامی فقہی

اکیڈمی مکہ مکرمہ یا اسلامی فقہ اکیڈمی جدہ یا ادارہ تحقیقات اسلامیہ ازہر یا شمالی امریکہ کی فقہ اکیڈمی یا یورپین کونسل برائے افتاء و تحقیق ہے۔"[۳۰]

2) دوسری قسم میں وہ ادارے شامل ہیں جو کسی ایک فقہی مذہب یا ایک خطے کے علماء پر مشتمل ہوں۔ڈاکٹر احمد ریسونی لکھتے ہیں:

"اسی قسم کی کسی مجلس کا ہونا لیکن وہ کسی ایک خطے یا مذہب کے علماء پر مشتمل ہو۔اس کی مثال فقہی مجالس یا علاقائی و مذہبی افتاء کے ادارے ہیں۔اس قسم کے ادارے اس وقت اکثر و بیشتر اسلامی ممالک میں موجود ہیں اور ان پر کام ہو رہا ہے۔"[۳۱]

۳) تیسری قسم کی علمی مجالس وہ ہیں جو کسی خاص نظم کے تحت نہ ہوں بلکہ علماء کی ایک جماعت مخصوص وقت کے لیے ایک خاص جگہ پر جمع ہو اور کانفرنس یا سیمینار کی شکل میں کوئی اجتماعی رائے جاری کر دے۔ڈاکٹر احمد ریسونی لکھتے ہیں:

"کسی ایک علاقے یا ایک سے زائد ممالک سے تعلق رکھنے والے علماء کی ایک کثیر تعداد مثلاً دسیوں علماء کا کسی نظم کے بغیر جمع ہونا اور کسی بھی مسئلے کے بارے میں باہمی گفتگو کرنا اور پھر اس کے بارے میں ایک اتفاقی فیصلہ جاری کرنا۔اس کی مثال بعض کانفرنسیں اور سیمینارز وغیرہ ہیں۔"[۳۲]

4) چوتھی قسم کی علمی مجالس کی مثال استفتاء کی سی ہے یعنی کوئی ایک عالم دین یا محقق کسی مسئلے میں اپنی تحقیق علماء کی ایک جماعت کے سامنے پیش کرے اور پھر ان کی اتفاقی رائے کو ایک اجتماعی فتوی کی صورت میں بیان کر دیا جائے۔ڈاکٹر احمد ریسونی لکھتے ہیں:

"ایک یا ایک سے زائد علماء کا کسی قسم کا علمی اجتہاد یا فتوی تیار کرنا اور پھر اس کو علماء کی ایک قلیل یا کثیر جماعت پر پیش کرنا۔ان علماء کا اس تحقیق کو پڑھنا اور اس مسئلے کے بارے اپنی آراء پیش کرنا۔پھر اس تحقیق کو اس طرح شکل دینا کہ جس طرح علماء نے اس کو قبول کیا ہو اور اس کے ساتھ موافقت اختیار کی ہو۔"[۳۳]

علمی مجلس اہل حل وعقد کے فتاوی کی حیثیت

علمی مجلس اہل حل وعقد سے صادر ہونے والا فتوی کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔پہلی صورت تو یہ ہے کہ ایسی مجلس کے تمام اراکین باہمی مباحثے اور مکالمے کی صورت میں کسی ایک رائے پر متفق ہو جائیں۔اس صورت میں اس کو جمہور کا اجماع کہا جا سکتا ہے جیسا کہ بعض سلف صالحین نے یہ اصطلاح استعمال بھی کی ہے۔بعض علماء کا خیال ہے اگر کسی خطہ میں

ایک ہی مجلس علمی قائم ہو اور کسی پیش آمدہ مسئلے میں اس مجلس علمی کی رائے متفقہ طور پر جاری ہو جائے تو پھر مستفتی کے لیے اس مجلس کے فتوی پر عمل لازم ہو گا۔ شیخ عبد الستار عبد الجبار کہتے ہیں:

"جو فتوی اس قسم کی مجلس علمی سے صادر ہو گا، اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو وہ علماء کا اتفاقی فتوی ہو گا اور اس وقت اس فتوی کا نفاذ لازم ہو گا کیونکہ جس جگہ فتوی پوچھنے والا فتوی پوچھ رہا ہے اس خطے میں اس مجلس کے علاوہ کوئی اور مفتی نہیں ہے۔ اور اس کے لزوم کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اہل علم کی ایک عظیم جماعت نے یہ فتوی جاری کیا ہے پس اس حالت میں مستفتی کے لیے اس فتوی پر عمل لازم ہو گا جیسا کہ امام نووی رحمہ اللہ نے ذکر کیا۔ لیکن اگر مجلس کے علماء کا آپس میں ہی اختلاف ہو جائے تو فتوی پوچھنے والے کے لیے اب تخییر جائز ہے۔ اس صورت (یعنی اختلاف علماء) میں یہ جائز نہیں ہے کہ کسی بھی شخص کو کسی مفتی کی رائے پر عمل کا پابند بنایا جائے سوائے اس کے کچھ کمپنیاں یا اسلامی بینک اپنے لیے یہ لازم کر لیں کہ وہ کسی معین مفتی یا مجلس شرعی کے فتوی کی پابندی کریں گے۔"[۴۴]

خلاصہ کلام

اس وقت پاکستان میں دونوں قسم کی مجالس اہل حل و عقد کے لیے دو بہترین پلیٹ فارم موجود ہیں۔ مقتدر مجلس اہل حل و عقد کو قومی اسمبلی اور علمی مجلس اہل حل و عقد کو سینٹ کے مقام میں جمع کیا جا سکتا ہے کیونکہ قومی اسمبلی صدر، وزیر اعظم یا حکمران کے اختیارات، ریاست کے انتظام و انصرام اور اندرونی و خارجہ پالیسی متعین کرنے کے لیے ایک مناسب پلیٹ فارم ہے جبکہ سینٹ میں علماء، فقہاء، ماہرین فن اور اسکالرز حضرات کو مناسب نمائندگی دیتے ہوئے اسے قانون سازی بذریعہ اجتماعی اجتہاد کا ایک بہترین ادارہ بنایا جا سکتا ہے۔ لیکن اس صورت میں یہ ایک سرکاری علمی مجلس اہل حل و عقد ہو گی اور قومی اسمبلی سے قانون سازی کا اختیار لے لیا جائے گا اور اس کا کام صرف امام کا انتخاب ہو گا یا امامت سے متعلق دیگر فیصلوں کا نفاذ جیسا کہ امام کی معزولی وغیرہ۔

باقی اگر کسی خطہ ارضی میں مسلمان علماء کی کوئی مجلس قائم ہے اور لوگ مسائل شرعیہ میں اس مجلس کی طرف رجوع کرتے ہیں اور وہ مجلس کسی شخص یا ادارے کو اتفاق رائے سے فتوی جاری کر دیتی ہے تو اس شخص یا ادارے کے لیے اس فتوی کی پابندی کے لزوم کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص اپنے کسی مسئلے میں "یورپین اسلامی کونسل برائے افتاء و تحقیق" کی طرف رجوع کرتا ہے اور کونسل اس کے مسئلے میں کوئی متفقہ فتوی جاری کر دیتی ہے اور بعد ازاں وہ شخص "**هيئة كبار العلماء، السعودية**" یا مصر کے فقہاء کی حکومتی اکیڈمی "**مجمع البحوث الإسلامية**" سے اس مسئلے کے بارے فتوی حاصل کر لیتا ہے جو کونسل کے فتوی کے برعکس ہے تو اب اس شخص پر کونسل کے فتوی کے لازم ہونے کی کیا دلیل ہے؟ انسان پر جو چیز لازم کی گئی ہے وہ یہ ہے کہ اگر وہ خود صاحب علم نہیں تو اصحاب علم و فضل کی طرف رجوع کر لیا کرے۔ اہل سنت میں سے کسی بھی امام کا یہ قول نہیں ہے کہ اگر کسی عامی نے کسی مسئلے میں کسی صاحب

علم کی طرف رجوع کیا تو اس کے فتوی پر عمل اس پر واجب ہو جائے گا۔لہٰذا شیخ عبد الستار عبد الجبار صاحب کی یہ رائے درست نہیں ہے کہ اگر مجلس کے علماء کا اتفاق ہو تو مستفتی پر فتوی لازم ہو جائے گا۔ قاضی کا فیصلہ نافذ ہوتا ہے لیکن مفتی کا فتوی نہیں،اس کی حیثیت ایک رائے اور مشورے کی سی ہوتی ہے۔

حواشی وحوالہ جات

۱ صالح بن عبداللہ بن حمید، الدکتور، الاجتہاد الجماعی واہمیتہ فی نوازل العصر، المجمع الفقہی الاسلامی، مکۃ المکرمۃ، ۲۰۰۹ء، ص ۱۴

۲ الزَّبیدی، محمّد بن محمّد بن عبد الرزاق الحسینی، تاج العروس من جواہر القاموس، دار الہدایۃ، بیروت، ۳۱۸/۲۸

۳ ابن درید الأزدی، جمہرۃ اللغۃ، دار العلم للملایین، بیروت، الطبعۃ الأولی، ۱۹۸۷م، ۱۰۱/۱

۴ محمد بن ابی بکر بن عبد القادر الحنفی، مختار الصحاح، المکتبۃ العصریۃ، بیروت، الطبعۃ الخامسۃ، ۱۹۹۹م، ص ۷۹

۵ تاج العروس: ۳۹۴/۸

۶ مختار الصحاح: ۲۱۴

۷ الآمدی، ابو الحسن علی بن ابی علی، الاحکام فی اصول الأحکام، المکتب الاسلامی، بیروت، ۱۹۶/۱

۸ فخر الدین الرازی، محمد بن عمر بن الحسن، المحصول، مؤسسۃ الرسالۃ، بیروت، الطبعۃ الثانیۃ، ۱۹۹۷م، ۲۰/۴

۹ ایضاً

۱۰ الاسنوی، عبد الرحیم بن الحسن بن علی، نہایۃ السول شرح منہاج الوصول، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، الطبعۃ الأولی، ۱۹۹۹م، ص ۳۸۱

۱۱ ایضاً

۱۲ عبد الرحمٰن الجزیری، الفقہ علی المذاہب الأربعۃ، دار الکتب العلمیۃ، بیروت، الطبعۃ الثانیۃ، ۲۰۰۳م، ۳۶۷/۵

۱۳ ابن نجیم المصری، البحر الرائق شرح کنز الدقائق، دار الکتاب الاسلامی، بیروت، ۲۹۹/۶

۱۴ النووی، یحییٰ بن شرف، منہاج الطالبین وعمدۃ المفتین فی الفقہ، دار الفکر، بیروت، ۲۰۰۵ء، ص ۲۹۲

۱۵ مجموعۃ من العلماء، الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ، وزارۃ الأوقاف والشئون الاسلامیۃ، الکویت، ۱۱۵/۷

۱۶ الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ: ۱۱۵/۷-۱۱۶

۱۷ ابن عساکر، علی بن الحسن، تاریخ دمشق، دار الفکر، بیروت، ۱۹۹۵م، ۵۷/۲۰

۱۸ ابوزہرہ مصری، امام مالک، مترجم عبید اللہ قدسی، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ص ۱۳۷-۱۳۸

۱۹ عزیز الرحمٰن بجوری، مفتی، سیرت امام اعظم ابو حنیفہ، نگارشات پبلشرز، لاہور، ۲۰۰۷ء، ص ۱۴۵

۲۰ الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ: ۱۱۶/۷

۲۱ وَہبَۃ بن مصطفیٰ الزُّحَیْلِیّ، الدکتور الأستاذ، الفِقہُ الاسلامیُّ وأدلّتُہ، دار الفکر، بیروت، ۶۱۶۷/۸

۲۲ المحصول: ۲۰/۴

۲۳ الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ: ۱۱۶/۷-۱۱۷

۲۴ الموسوعۃ الفقہیۃ الکویتیۃ: ۱۱۷/۷
۲۵ صلاح الدین یوسف، مولانا، اجتہاد علماء کی نظر میں (سوالات وجوابات)، سہ ماہی منہاج، دیال سنگھ ٹرسٹ لائبریری، لاہور، جنوری ۱۹۸۳ء، ص ۲۸۵
۲۶ مولانا صلاح الدین یوسف، اجتہاد علماء کی نظر میں (سوالات وجوابات)، ص ۲۵۶
۲۷ تقی عثمانی، مفتی، الاجتہاد الجماعی، المجمع الفقہی الاسلامی، مکۃ المکرمۃ، ۲۰۰۹ء، ص ۱۳
۲۸ الشاوی، توفیق الدکتور، فقہ الشوری والاستشارۃ، دار الوفاء، المنصورۃ، ۱۴۱۲ھ، ص ۱۹۰
۲۹ فقہ الشوری والاستشارۃ: ص ۱۹۰
۳۰ احمد الریسونی، الدکتور، الاجتہاد الجماعی، المجمع الفقہی الاسلامی، مکۃ المکرمۃ، ۲۰۰۹ء، ص ۸-۹
۳۱ ایضاً: ص ۹
۳۲ ایضاً
۳۳ ایضاً
۳۴ محمد زبیر، ڈاکٹر حافظ، عصر حاضر میں اجتماعی اجتہاد: ایک تجزیاتی مطالعہ، مقالہ پی۔ایچ۔ڈی (غیر مطبوع)، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ص ۴۱۹